لمعاتِ فکر

ڈاکٹر اقبالؒ — ایک الہامی شاعر

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

ملّتِ ما شانِ ابراهیمی است

شهدِ ما ایمانِ ابراهیمی است

اُمّتِ او مثلِ او نورِ حق است

هستیِ ما از وجودش مشتق است

سوال: علامہ اقبالؒ کے افکار و خیالات کو ہمارے ہاں بڑی اہمیت دی جاتی ہے، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ علامہ کی شاعری سے آپ کے اساتذہ بالخصوص مولانا فراہیؒ بھی متاثر تھے یا نہیں؟

جواب: علامہ اقبالؒ نے جو تعلیم اپنے شعروں کے ذریعے دی ہے، اُس کے بارے میں میرا تاثر شروع سے یہ ہے کہ وہ نہایت پاکیزہ، نہایت زندگی بخش اور نہایت ایمان پرور ہے۔ شعر کی قید میں نے اس وجہ سے لگائی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے کچھ افکار و نظریات اُن ان کے خطبات کے ذریعے بھی ہم تک منتقل ہوئے ہیں۔ ان افکار و نظریات کے بعض حصوں کو میرے ذہن نے قبول نہیں کیا، لیکن اپنے شعروں میں ڈاکٹر صاحبؒ نے جو درس دیے ہیں، ان کو تو میں (الا ماشاء اللہ) الہام سمجھتا ہوں۔ میں شاعروں کے الہامی ہونے کے عام خیال کو، سچ پوچھیے تو، محض شاعرانہ تعلّی پر محمول کرتا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کے کلام کے مطالعے کے بعد اس بات کا قائل ہو گیا کہ ہمارے شاعروں میں سے کوئی اور شاعر الہامی ہو یا نہ ہو لیکن علامہ اقبالؒ ضرور الہامی شاعر ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا ہے:

"شعر میں حکمت ہوتی ہے اور بیان میں جادو"

یہ دونوں باتیں ڈاکٹر صاحب کے کلام پر صادق آتی ہیں۔

یوں مجھے دلچسپی تو غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ، اکبرؔ اور حسرتؔ کے کلام سے بھی بہت رہی ہے، لیکن ایمان تازہ کرنے کے لیے میں یا تو جوہر کی غزلیں پڑھتا رہا ہوں یا اقبالؔ کی نظمیں۔ مولانا حالیؔ سے بھی مجھے بڑی عقیدت ہے، لیکن ان کے مسدس سے میری قومی انا کو تو کچھ غذا مل جاتی ہے مگر روح تشنہ رہ جاتی ہے۔ روح کو سیرابی و آسودگی صرف ڈاکٹر صاحبؒ کے خُمِ معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ مجھے ایک زمانے میں مولانا رومؒ کی مثنوی سے بھی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ بھی ان کو اپنا مُرشد مانتے ہیں، اور وہ ہیں

بھی بجا طور پر اس منصب کے اہل۔ لیکن جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، میں ڈاکٹر صاحبؒ کی تعلیم کو اپنے ذوق، اپنی ذات، اپنی روح اور اپنے قرآنی فکر سے زیادہ ہم آہنگ و ہم رنگ پاتا ہوں۔ وہ جب فطرت و معرفت کے اسرار کھولتے ہیں تو بار بار دل میں خیال گزرتا ہے کہ یہ باتیں تو روح القدس کے فیض کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتیں، پھر ڈاکٹر صاحب جو معروف معنوں میں نہ کوئی صوفی تھے نہ سالک، اسرارِ معرفت کے یہ تارے کہاں سے توڑ کے لاتے ہیں؟

سرِّ خدا کہ سالکِ عارف بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروشش از کجا شنید

لیکن یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنے لیے ڈاکٹر صاحبؒ کے کلام کا شارح خود ہی ہوں، ان کے نئے شارحوں اور مفسروں پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ڈاکٹر صاحبؒ، حضرت حسینؓ سے زیادہ مظلوم اس دور میں قرآن کو سمجھتے تھے، اس لیے کہ اس زمانے میں وہ لوگ اس کی تفسیریں لکھ رہے ہیں جو ان کے خیال میں اس کام کے اہل نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس دور میں علامہ اقبالؒ بھی کچھ کم مظلوم نہیں ہیں، اس لیے کہ آج ان کے کلام کے نئے شارحین ان کے شعروں کو وہ وہ معانی پہنا رہے ہیں جو کبھی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ گزرے ہوں گے۔ ان کو اگر زندگی میں یہ پتہ چل جاتا کہ لوگ ان کے شعروں پر یہ ظلم کریں گے تو شاید وہ شعر کہنے ہی سے توبہ کر لیتے۔

یہ رجحان بھی میرے نزدیک کچھ صحیح نہیں ہے کہ ایک گروہ آج پورے دین کا ڈھانچہ ڈاکٹر صاحبؒ کے تصورات کی روشنی میں کھڑا کرنا چاہتا ہے اور ان تصورات ہی کو اس نے حق و باطل کی کسوٹی قرار دے دیا ہے۔ یہ اندازِ فکر، فرطِ عقیدت کی پیداوار ہے اور اس سے وہی مضر نتائج پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہوں گے جو شخصی عقیدت کے غلو سے ہمیشہ پیدا ہوتے ہیں، اگرچہ اس عقیدت کا مرکز کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ رہی ہو۔ ڈاکٹر صاحب کا مقام بہت اونچا ہے، لیکن وہ معصوم نہیں ہیں۔ ان کے کلام اور ان کے فکر کی روح اسلامی اور قرآنی ہے لیکن لغزشوں، بے اعتدالیوں اور خامیوں سے پاک نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کو اور ان کے کلام کو بلند سے بلند مقام دینے کے باوجود ان کو غیر معصوم عارفین و حکما ہی کے درجہ و مقام میں رکھنا چاہیے۔ حق و باطل کی کسوٹی قرآن اور پیغمبرؐ ہی کو ماننا چاہیے۔ اس سے علامہ اقبالؒ کے درجے اور ان کے کلام کے مرتبے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اسلام میں کسی

بڑے سے بڑے آدمی کا درجہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔ صرف پیغمبرؐ ہی کا درجہ اس سے اونچا ہے۔

مَیں نے جن لوگوں کے درمیان آنکھیں کھولیں اور جن کے فیضِ تعلیم و تربیت سے اکتساب کیا، اُن سب کو ڈاکٹر صاحبؒ کے کلام کی عظمت کا مدّاح و معترف پایا۔ ان سب کا اعتراف اسی پہلو سے تھا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کا کلام دلوں کو گرمانے اور روحوں کو تڑپانے والا ہے۔ میرے ایک محبوب استاد نے، جن کی ذہانت اور وسعتِ نظر کے ان کے اکابر تک مدّاح و معترف تھے، میرے دل میں ڈاکٹر صاحب کی تعلیمات کی عظمت اس زمانے میں پیدا کی جب مَیں اُن کے کلام کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہی نے مجھے حالؔی اور اقبالؔ کی تعلیم کا یہ فرق بتایا کہ حالؔی کی دعوت یہ ہے کہ:

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

اقبالؔ کی دعوت یہ ہے کہ:

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز"۔

مَیں خود چونکہ فطرتاً اسی ذہن کا آدمی ہوں اور اسلام میرے نزدیک یہی ذہن پیدا کرتا ہے، اس وجہ سے مَیں حالؔی سے عقیدت کے باوجود شروع ہی سے اقبالؔی بن گیا، اور اب تک اقبالؔ ہی کے آستانۂ فکر کا مجاور ہوں۔ میرے استاد مولانا فراہیؒ شعر و سخن کا نہایت اعلیٰ مذاق رکھتے تھے لیکن جس دَور میں اُن کی صحبت اُٹھانے کا شرف مجھے حاصل ہُوا ہے، اُس دَور میں وہ دوسری تمام چیزوں سے منقطع ہو کر کلیتہً قرآن کے زاویے میں منعکف ہو چکے تھے۔ شعر و شاعری کا ذکر ان کی مجلس میں ہوتا بھی تو بات یا تو عرب شعراء تک محدود رہتی اور اگر کسی پہلو سے کچھ مزید وسعت اختیار کرتی تو مولانا رومؒ، حافظؒ، سعدیؒ سے شروع ہو کر غالبؔ پر ختم ہو جاتی۔ ڈاکٹر اقبالؒ کے متعلق مولاناؒ کا خیال مجھے معیّن الفاظ میں معلوم نہ ہو سکا کہ میں اس کی روایت کر سکوں لیکن مولاناؒ نے اپنی کتاب 'جمہرۃ البلاغۃ' میں اعلیٰ کلام کے لیے جو معیار قرار دیا ہے، اس پر کسی کو پرکھتا ہوں تو اس معیار میں، اگر ہمارے شاعروں میں سے کسی کا کلام بتمام و کمال پورا اترتا ہے تو وہ ڈاکٹر صاحبؒ کا کلام ہے، اس لیے کہ روح اور اور نفسِ ناطقہ کا ترجمان، حقیقی معنوں میں، انہی کا کلام ہے۔ اپنے اساتذہ کے سوا ان اکابرِ علم و ادب کو بھی مَیں نے ڈاکٹر صاحبؒ کا معترف بلکہ گرویدہ پایا جن سے میرے نیازمندانہ و خادمانہ تعلقات رہے ہیں، مثلاً مولانا سلیمان ندوی مرحوم، مولانا عبد السلام ندوی مرحوم اور مولانا

عبدالماجد دریا آبادی مرحوم۔ ان حضرات نے ڈاکٹر صاحبؒ کی شاعری اور ان کی تعلیمات پر جو خراجِ تحسین ان کو پیش کیا ہے، وہ تمام اہل علم کے سامنے ہے۔ بعض لوگوں کو میں نے ڈاکٹر صاحبؒ کا نکتہ چیں بھی پایا ہے، لیکن صرف زبان کی حد تک۔ ان کی تعلیم و دعوت کو بحیثیتِ مجموعی سبھی نے مزاجِ اسلام سے بالکل ہم آہنگ قرار دیا ہے۔ جو لوگ ڈاکٹر صاحبؒ کی زبان پر نکتہ چینی کرتے ہیں، اُن کو میں یہ جواب دیا کرتا ہوں کہ جس عالم میں پہنچ کر وہ شعر کہتے ہیں، وہاں صرف معانی کا سکہ رواں ہے، الفاظ کی حکومت وہاں ختم ہو جاتی ہے۔ میرے استاد مولانا فراہیؒ زبان کو بڑی اہمیت دیتے تھے لیکن وہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ بعض مرتبہ الفاظ شاعر کی بلند پروازی کا ساتھ نہیں دے سکتے، اس وجہ سے وہ ان کو پیچھے چھوڑ جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

(ترتیب: خالد مسعود۔ بشکریہ: تدبر)